Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:11 (1967) © rasailojaraid.com

علماء دوراہے پر

الطاف جاوید

پچھلے دنوں زکوٰۃ کی نوعیت اور شرح کے متعلق ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بیان پر بعض علمائے کرام کی طرف سے جس متشدد ردّ عمل کا اظہار کیا گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شائد طبقہ علماء نے اس بیان کو اپنے وجود کے لئے ایک خطرہ تصوّر کیا ہے۔ حالانکہ اس بیان میں دین اسلام کے کسی بنیادی رکن کا نہ تو انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ محض تعبیر کے اختلاف پر مبنی ہے اور ایسا اختلاف نہ صرف ہمارے تمام جلیل القدر فقہائے سلف میں پایا جاتا رہا ہے بلکہ آج تک کی اسلامی تاریخ میں تمام علماء اسلام کے بنیادی ارکان کے متعلق اس کا عملی طور پر اظہار کرتے ہیں۔

اس شدید جذباتیت کا، جس کا مظاہرہ ہمارے بعض علماء کرام کی طرف سے کیا گیا ہے، اگر عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ردّ عمل معمولی نہیں ہے، اس کی جڑیں ہماری معاشرتی حقیقت میں پیوستہ ہیں۔ اس ردّ عمل کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ یہ پاکستان میں تیزی سے اُبھرتی ہوئی صنعت کی وجہ سے جدید فکری اور معاشرتی قوتوں کے ساتھ علماء کی جامد تقلید پرستی اور ماضی پسندی کی واضح اور نمایاں آویزش ہے۔

ردّ عمل کی اہمیت

یہ ردّ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے ان علماء نے اس جدید معاشرتی تبدیلی کو، جس کی فکری نمائندگی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کر رہے ہیں، اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا ہے۔ لیکن علماء کی اس بے چینی اور اظہار نفرت نے ہمارے سامنے بے حد اہم اور سنجیدہ سوالات پیدا کر دیئے ہیں جن کے حل پر ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامل طور پر اسلامی احکامات وہدایات کے مطابق ڈھال سکیں؛ اپنی نئی نسل کے قلب و دماغ میں اسلام کی عظیم اقدار اور تابناک روایات کو سمو سکیں اور اس خلیج کو پاٹ سکیں، جو میکیاولی کے سیاسی نظریات کی وجہ سے ریاست اور مذہب کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

جدید حقائق کے خلاف علماء کے اس متشدد رویّہ کی وجہ سے آج ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ختم نبوت

کے ساتھ ہی کیا اختلافِ لیل ونہار، انسانوں کے درمیان تداولِ ایام اور شئونِ الٰہیہ میں ہمہ دم تبدیلی کا عمل رُک گیا ہے، جو زمانِ متسلسل کے خاموش سیلان اور اس کی وجہ سے ہماری حیاتِ معاشرہ میں نت نئے تغیرّات اور ان تغیرّات کی وجہ سے نئے معاشرتی، سیاسی اور فکری تقاضوں کی تخلیق کا باعث بنتا رہتا ہے۔

اگر یہ مذکورہ حقائق صحیح ہیں اور جیسا کہ قرآنِ حکیم نے اپنی متعدد اور مکرّر آیات میں بار بار ان حقائق کو واضح فرمایا ہے، تو ہمارے علماء کے پاس اپنے اس رویہّ کا کیا جواز ہے کہ قیامت تک کے لئے آنے والی اُن اَن گنت معاشرتی تبدیلیوں اور ان کے تقاضوں کی ہر حیثیت کے متعلق ہمارے فقہاءِ سلف تمام جزئیات مرتب کر چکے ہیں جن کی نوعیت اور حقیقت کے ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو کو بھی ہماری تخیئیل یا واہمہ کی بلند ترین پرواز بھی اپنی گرفت میں لانے سے قاصر ہے۔

اگر علماء کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو حق تعالیٰ کی خلاّقی کا تسلسل ختم ہو جاتا اور اس کی صفات کی دوامیت معطل ہو جاتی ہے۔ جب کہ قرآن حکیم باری تعالیٰ کی ممکنات ذات کے مسلسل انکشاف سے پیدا ہونے والے حقائق کے غیر مختتم ہونے کا ثبوت اپنی آیات مقدسہ میں فراہم کرتا ہے۔

قل لوکان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولوجئنا بمثلہ مددا (کہف)

(کہہ دو اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں (کے لکھنے کے) لئے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر ختم ہو جائے۔ اگر ویسا ہی اور اس کی مدد کو لائیں)

عہد نبویؐ کے سادہ معاشرہ نے اپنی ضروریات کے مدّنظر زکوٰۃ کے ٹیکس کی ایک شرح مقرر کر لی تھی اور اس شرح میں مملکت کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور ذرائع پیداوار اور مواصلات کی ترقی کے لئے یقیناً مزید اضافہ کیا جاتا، لیکن بہت جلد ایک المناک سیاسی تبدیلی نے زکوٰۃ کے اس مقصد کو نظروں سے اوجھل کر دیا اور بیت المال کے اجتماعی مالیاتی نظام کو ختم کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ زکوٰۃ کے اس نظام کا احیاء کس طرح کیا جائے۔ چودہ سو برس کے زمانی بُعد نے کئی مشکل مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور معاملات کی تمام اشکال قطعی طور پر بدل چکی ہیں۔

قرآن حکیم کی متعیّن کردہ مدّاتِ زکوٰۃ جن طبقات کے لئے وضع کی گئی تھیں، وہ دراصل عہد نبوی کے مدنی معاشرہ کے مظلوم اور پس ماندہ طبقات تھے مگر آج پاکستانی معاشرہ جو اپنی ہیئت ترکیبی میں بے حد پیچیدہ اور آبادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ قرآنی مدّاتِ زکوٰۃ کی ان تاریخی خصوصیات کو جو عہد نبوی کے معاشرہ کا لازمہ تھیں، من و عن اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔ کیونکہ معاشرتی طبقات کی نوعیت بدل چکی ہے۔

عہد نبوی میں ابن سبیل، فقراء و مساکین، غلام اور مقروض طبقے جن معاشی اور معاشرتی خصوصیات کے ساتھ پائے جاتے تھے، آج ان تمام طبقات پر مشتمل ایک ہی طبقہ موجود ہے۔ جسے جدید اصطلاح میں "محنت کش طبقہ" کہا جاتا ہے۔ بھیک منگے اور اپاہج وغیرہ ناقابل اعتنا ہیں، کیونکہ یہ کوئی طبقاتی بنیاد نہیں رکھتے۔ جب محنت کش طبقہ کی معاشی حالت بحیثیت مجموعی درست ہو گی تو یہ لوگ خود بخود عنقا ہو جائیں گے۔ فوجوں کی تیاری اور ان کے لوازمات اور جنگی ساز و سامان کے اخراجات اس عہد سے قطعاً مختلف اور بے حد اضافہ پذیر ہیں، فی سبیل اللہ اپنی ہیئت قطعاً بدل چکا ہے۔ اسی طرح تالیف قلوب کی مد بھی اپنی ابتدائی سادا شکل بدل چکی ہے۔ سفارت خانوں کے قیام اور دوسری سلطنتوں کے سربراہوں کی آمد پر ان کے استقبال، بیرون ملک تبلیغی مشنوں کے قیام وغیرہ پر اخراجات کی نوعیت قطعاً اور ہے۔

آج ساری دنیا کی مملکتیں زکوٰۃ جیسے ٹیکس کے بغیر ہی ان تمام مدّات پر زر کثیر صرف کر رہی ہیں، جنہیں قرآن مجید نے معاشی ناہمواری کے خاتمے اور معاشرتی خوشحالی کو عمل میں لانے کے لئے متعین کیا ہے! اشتراکی اور غیر اشتراکی دونوں معاشرے اپنی اپنی حدود میں قرآن حکیم کے ان معاشی اور معاشرتی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ مقاصد انسانی ہیں جو عالمگیر انسانی معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محض مسلم معاشرہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ پاکستان میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ٹیکسوں کی مجموعی مقدار کمی سو فیصد تک پہنچ رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود عوام کے معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے باہر سے مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر علما چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کی جائے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ مملکت کے کیریکٹر کو سیکولر بنا دیا جائے، چاہے یہ اشتراکی سیکولرازم ہو یا غیر اشتراکی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ کی قدیم شرح آج کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔

زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کر کے اسے ایک زندہ معاشرتی حقیقت بنانے سے گریز اس بات پر دال ہے کہ ہمارے معاشرہ میں زکوٰۃ اور خیرات کے ہم معنیٰ ہو جانے کی وجہ سے زکوٰۃ کے مفہوم میں جو تذلیل داخل ہو چکی ہے، علماء اس کا ازالہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اسے بدستور قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی - اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ (اقبال)

دوسری وجہ یہ ہے کہ علماء کے دار العلوم اور ان کی ذاتی ضرورتیں اسی زکوٰۃ یعنی خیرات سے پوری ہوتی ہیں -
اس لئے وہ زکوٰۃ کو طبقات کے معاشی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے مرکزی خزانہ اور اس کے مالیاتی نظام کے ماتحت نہیں لانا چاہتے. حالانکہ قرآن حکیم کی رُو سے زکوٰۃ ایسا معاملہ نہیں ہے، جسے ادا کرنے وقت امراء عوام پر اپنا احسان تصوّر کریں، بلکہ زکوٰۃ غرباء کا وہ حق ہے جس کی مدد سے معاشیات کی اصطلاح میں قدر زائد کو اس کے پیدا کنندہ کی طرف واپس لوٹایا جاتا ہے۔

وفی اموالھم حقٌ للسّآئِل والمحروم (ذاریات) (اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کا)

والذین فی اموالھم حقٌ معلوم ٥ للسّآئِل والمحروم (معارج)

(اور وہ لوگ کہ ان کے مالوں میں معین حق ہے سائل اور محروم کا)

سائل اور محروم کے الفاظ کا مفہوم آج کل کے بھک منگے اور معذور ادا نہیں کر سکتے۔ قرآن حکیم نے انہیں بڑے وسیع اور جامع معانی کے لئے استعمال کیا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں غلام، فقراء و مساکین، ابن سبیل، مقروض وغیرہ پر مشتمل پس ماندہ طبقوں کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اور آج یہ تمام طبقے محنت کش کے لفظ میں اپنی ترجمانی کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کا منشا یہ ہے کہ صاحبِ فضل و مال اپنی دولت کو پس ماندہ طبقوں کی طرف لوٹائیں تاکہ معاشی امتیاز جاتا رہے اور معاشرہ میں معاشی مساوات قائم ہو کر خوش حالی و فارغ البالی کا دَور دورہ ہو۔

واللہ فضّل بعضکم علیٰ بعضٍ فی الرّزق ج فما الذّین فضلوا برآدی رزقھم علیٰ ما ملکت ایمانھم فھم فیہِ سوآءٌ ط افبنعمۃِ اللہ یجحدُون (النحل) (خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی۔ تو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنا رزق اپنے مملوکوں کو دے ڈالنے والے ہیں کہ سب اس میں مساوی ہو جائیں۔ تو کیا یہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں)

ملکت ایمانھم، اس عہد کا سب سے بڑا اور مظلوم طبقہ تھا، جس طرح آج پرولتاریہ ہے اور فقراء و مساکین، ابن سبیل وغیرہ اس طبقہ کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں۔ آیت بتاتی ہے کہ صاحبِ جائداد طبقہ اگر اپنا مال محروم طبقات کی طرف نہیں لوٹائے گا اور معاشرہ معاشی لحاظ سے مساوی حالت میں نہیں آئے گا تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت کا انکار ہو گا جس کا نتیجہ آج کی زبان میں معاشی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علماء کے اس رویّہ سے نہ صرف ملّی نظام حیات کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے عمل میں خلل واقع ہوتا ہے۔ بلکہ اسلام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ معاشرتی طبقہ کی بھی توہین ہوتی ہے۔

فکر کے جدلیاتی اور استقرائی طریق کے بجائے مابعد الطبیعی اور استخراجی طریق کو اپنانے کی وجہ سے علماء اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ شریعتِ مطہّرہ کے ہر حکم کا ایک معنی ہوتا ہے اور ایک صورت اور صورت سے مقصود محض معنی کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ قانون ہے کہ معنی جب خارج میں اپنی خفتہ قوتوں اور ممکنات ذات کا تحقق چاہتا ہے تو انکشافِ ذات کے اس عمل کے دوران ہر مرحلہ پر اس کی صورت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بیج کے پھوٹنے سے لے کر تناور درخت بننے تک ہر مرحلۂ ارتقاء میں اس کے مافیہ کی تبدیلی کے ساتھ اس کی ہیئت بھی بدلتی چلی جاتی ہے۔ اگر بیج کا چھلکا یا صورت اپنے آپ کو تبدیل کرنے سے انکار کر دے تو بیج کے داخلی ممکنات کا بروئے کار آنا محال ہی نہیں، ناممکن ہے۔

قرآن حکیم کی وہ آیات جنہیں محکمات کہا جاتا ہے اور مدینہ نبوی کی پہلی اسلامی جمہوریّت کے قوانین، جنہیں بقول امام ولی اللہ دہلویؒ، موطا مالک میں منضبط کر دیا گیا ہے' بیج کا مرتبہ رکھتے ہیں، جس نے ابھی تناور درخت بننا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

مدینہ منورہ کی ابتدائی اسلامی مملکت کی حدود سے جب اسلام باہر نکلا تو راستے میں کلدانی، بازنطینی، ایرانی، مصری اور ہندی وغیرہ جتنی تہذیبیں آتی رہیں، فقہاء عظام انہیں اسلام میں جذب کرنے کے لئے محکمات قرآنی اور مدنی سوسائٹی کے قوانین کی روشنی میں ان کی خصوصی نوعیت کے مطابق فقہی جزئیات کو مرتب کرتے چلے گئے اور وقت کے ساتھ ترتیب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور اس طرح ابتدائی مدنی اسلامی مملکت کی ہیئت ترکیبی، قانونی ڈھانچہ، فلسفہ و کلام کے مختلف مدرسے۔ ادب و فن کے نمونے، تعلیمی نظام، لباس، زبان، تعمیر اور معاشرتی آداب غرض اپنی کلّی حیثیت سے بتدریج تبدیل ہوتی اور اضافہ پذیر ہوتی رہی۔

یہ سب کچھ چودھویں صدی عیسوی تک ہوتا رہا ہے تو اس کے بعد مغربی اقوام کی نشاۃِ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے زندگی اور اس کے تمام فکری، معاشی، سیاسی اور معاشرتی اداروں میں جو بنیادی تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے تو یہ قانونِ تغیرّ و ارتقاء، بحیثیت کائناتی قانون کے، مسلم ممالک پر اپنا عمل کیسے ختم کر سکتا تھا۔

جس طرح پہلی صدی ہجری کے بعد اسلام کو مختلف اقوام اور ان کی تہذیبوں سے واسطہ پڑا تھا، آج ایک بار پھر وہ اسی دوراہے پر آ گیا ہے۔ وہ علماء سے مطالبہ کرتا ہے کہ دورِ اوّل کی طرح وہ اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں اور وقت کے سیلان نے جو نیا رُخ اختیار کیا ہے، اس کے مطابق اپنے فکر و عمل میں تبدیلی پیدا کریں۔

اب اگر علماء نے اسلام کے اس مطالبہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا، اگر انھوں نے نئے تغیر و ارتقاء کے قدموں کی چاپ کو نہ سنا، جسے وقت اپنے دامن میں لئے ایک طوفان کی طرح آگے بڑھ رہا ہے، تو قرآن کے الفاظ میں ان کا یہ رویہ ظلم کے مترادف ہوگا اور قرآن ہی بتاتا ہے کہ ظالم طبقے کبھی بھی پنپ نہیں سکتے۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا (انعام)۔ (اُن لوگوں کی جڑیں جنہوں نے ظلم کیا، کٹ گئیں)

ترکی، ایران، مصر، افغانستان اور وسط ایشیا میں وقت اس قرآنی قانون کو عمل میں لا چکا ہے اور یہ قطعاً سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ پاکستان میں وقت اس قانون کو کیوں ترک کر دے گا۔ کیوں یہاں بھی تاریخ کی ابھرتی ہوئی جدید قوتیں علماء کے ساتھ وہ واقعہ نہ دہرائیں گی جو مذکورہ مسلم ممالک میں دہرایا جا چکا ہے۔ اگر علماء کی آنکھیں کھلی ہیں تو وہ دیکھ سکتے ہیں کہ جب انھوں نے وقت کی منطق کے مطابق چلنے سے انکار کر دیا تو قرآنی قانون استبدال کے مطابق دوسروں نے ان کا منصب جلیل سنبھال لیا

وَاِن تتولّوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ٥ (محمدؐ)۔ (اگر تم منہ پھیر لوگے تو اللہ تمہارے علاوہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہیں ہوں گے)

اور یہ اس لئے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ قدیم کی جگہ بوقت ضرورت جدید کو تخلیق فرما دیتے ہیں۔

اِن یّشأ یُذھبکم و یات بخلقٍ جدید (فاطر)۔ (اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور نئی مخلوق لے آئے)

وہ زبان جو وقت کے نئے تقاضوں کے عین مطابق ہو، اور جو حق تعالیٰ کی نئی شان کے اقتضاآت کی ترجمانی کر رہی ہو، اس زبان کو بند کرنا علماء کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے کیونکہ حق تعالیٰ جب نئی شان اور نئی شکل میں جلوہ افروز ہو تو اس کی نئی شان اور نئے مطالبوں کی نمائندگی کرنے والی زبانیں، تاریخ انسانی کے کسی موڑ پر بھی بند نہیں کی جا سکیں، تھوڑی سی کشمکش کے بعد رجعت پسند قوتیں جنہیں حق تعالیٰ کی نئی شان OUT DATED قرار دے چکی ہوتی ہیں، ہمیشہ کے لئے ماضی کی اندھیاریوں میں دفن کر دی جاتی ہیں۔

بَل نقذف بالحقّ علی الباطل فیدمغہٗ فاذا ھُو زاھقٌ (الانبیاء)۔ (بلکہ ہم باطل پر حق کو دے مارتے ہیں تو حق باطل کو زیر کر لیتا ہے۔ اور باطل تو ہے ہی نابود ہونے والا)

فطرت کے اس قانون قاہر کے سامنے نحن ابناء اللہ (ہم اللہ کے بیٹے ہیں) کی لن ترانیاں نہیں چلا کرتیں۔ کیونکہ نینوا و بابل کی عظیم سرزمین کا کوئی آہنی حوصلہ مند تاجدار ان کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات یہ ہے کہ انگریز کی آمد کے ساتھ جس صنعتی نظام نے یہاں کے جاگیرداری عہد کو شکست دے کر اپنے قدم جمائے تھے اور صنعتی نظام کی وجہ سے سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت پانے سے جس ذہنی انقلاب نے آنکھ کھولی تھی اور اس ذہنی انقلاب سے ہماری معاشرتی اور تعلیمی زندگی جس طرح متاثر ہوئی اور اس کے ادب میں نئے زاویہ ہائے نگاہ، معروضی تجزیہ و تنقید، تعلیم نسواں کی وجہ سے اس طبقہ میں آزادی و خود اعتمادی کی ترویج، طبیعی اور سوشل سائنسوں کی وجہ سے جاگیرداری عہد کے مذہبی ادب و عقائد پر نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی تنقید کی وجہ سے نئے علم الکلام کی تدوین۔ تسخیر فطرت کی وجہ سے زمان و مکان پر قبضہ اور اس سے اوقاتِ کار میں نمایاں کمی اور فارغ اوقات میں اضافہ، ذہنی افق اور نقطۂ نظر میں وسعت پذیری، ادب کی ہیئت پر مافیہ (مواد) کو ترجیح اور کلاسکیت پر رومانیت کی فتح پانے کی وجہ سے جس نئی زندگی نے جنم لیا تھا، اس کے ساتھ ماضی کے صالح عناصر کو مل کر ایک نئے تہذیبی ائتلاف کو تشکیل دینا چاہئے تھا، مگر ہمارے مذہبی طبقہ نے اپنی پولٹیکل شکست کا بدلہ اس طرح لیا کہ اس نے عہد رفتہ کی بازیابی کی غرض سے اس نئی زندگی کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح جدید و قدیم کے اس تصادم سے کوئی مثبت اختلاف بروئے کار نہ آسکا، بلکہ حیات معاشرہ کے قواء میں انتشار اور بحران پیدا ہو گیا۔

علماء کی اس اجتہادی غلطی کی وجہ سے ان کے قدم حیات کی نئی تاریخی شاہراہ سے ہٹ گئے اور وقت کے جدید تقاضوں کو لادینی اور بدعتی امور پر محمول کر کے ان کی مخالفت کرنے سے وہ مملکتی کاروبار میں بار نہ پاسکے اور یوں وہ اس عملی تجربہ سے محروم رہ گئے، جس کی مدد سے قرآن و سنت کے بنیادی تصوّرات و قوانین پر کسی نئی تمدنی اور تہذیبی عمارت کی تعمیر کی جا سکتی تھی۔

جدید و قدیم کے تصادم نے کسی مثبت ائتلاف کی شکل اختیار کرنے کی بجائے ایک نئے رُخ کو اختیار کیا یعنی نئے تعلیم یافتہ مسلم ذہن نے جو صنعتی نظام کے تمام نئے تقاضوں کو اپنا چکا تھا، اسلام کی ایک ایسی تعبیر کی جو تاریخ کے جدید تقاضوں کو کافی حد تک پورا کرتی تھی۔ یہ تعبیر حیاتِ تازہ کی گہرائیوں میں ڈوب کر تیار کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی دستاویز تھی جسے خونِ دل و جگر کے سرمایہ سے تحریر کیا گیا تھا۔

اس تعبیر نے اسلام کی قدیم روایتی تشریح کے برعکس مملکتی کاروبار اور مذہبی اعمال میں ثنویت کی موجودگی اور مسلم پرسنل لاء پر اکتفا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ قرآنی تعلیمات کے عالمگیر کیریکٹر اور جامعیت کے پیش نظر پوری زندگی اور اس کے تمام اداروں کو اسلامی نہ بنایا گیا تو یہ روحِ اسلام کے منافی ہوگا۔ اس تعبیر کی تدوین میں مصطفےٰ کمال کی ترکی، جدید مصر، بولشویک مسلم وسطی ایشیا اور متحدہ ہندوستان کی مغربی

یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ مسلم عناصر نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر حصہ لیا تھا۔ مگر ہر جگہ تاریخی عمل کی نوعیت کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف نتائج برآمد ہوئے۔

کمالی ترکی میں جدید قوتوں نے قدامت کے خلاف جارحانہ شکل اختیار کر لی۔ بولشویک مسلم وسطی ایشیا میں یہ تعبیر مقامی تقاضوں کی وجہ سے دب گئی۔ جدید مصر میں یہ نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس خطۂ ارض میں حیات نو کی تشکیل میں ایک عظیم قوت بن گئی۔ متحدہ ہندوستان میں اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کو علیحدہ کر کے ایک نئی مسلم مملکت کی داغ بیل ڈالنے کی جدوجہد شروع کر دی، جس میں زندگی کو اجتماعی طور پر اسلامی بنانے کے عظیم کام کو جاری رکھا جا سکے۔

ایران، مصر اور ترکی میں مسلم اکثریت کی وجہ سے قومی تحریکوں نے جنم لیا۔ وسطی ایشیا میں غیر مسلم اکثریت کے انقلابی کردار کی وجہ سے مسلم اقلیت نے اپنا انفرادی وجود کھو دیا۔ مگر متحدہ ہندوستان میں یہاں کے مخصوص مقامی حالات کی وجہ سے مسلم اقلیت نے اپنے وجود کی نفی کرنے کی بجائے ملکی تقسیم کا راستہ اختیار کر لیا۔ اور یہ علیحدگی پسند تحریک قدامت پرست مذہبی طبقہ کی شدید مخالفت کے باوجود، ایک نئے مسلم اکثریت والے خطہ کو تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئی۔

پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد اس تعبیر کو قدامت پسند علماء کی مخالفت کے علاوہ جاگیردار اور منافع خور سرمایہ دار کے غیر انسانی اور غیر اسلامی مفادات سے متصادم ہونا پڑا۔ اگرچہ ان عناصر کی وجہ سے اسلام کی اس نئی تعبیر کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامل طور سے کامیابی نہیں ہوئی مگر جوں جوں صنعتیں پھیلتی جا رہی ہیں، ملکی یونیورسٹیاں نئی تعلیم کی روشنی کو عام کرتی جا رہی ہیں۔ افریشیا اور لاطینی امریکہ کی نوآبادیات میں غیر ملکی قوت کے خلاف سیاسی اور معاشی آزادی کی تحریک شدت اختیار کرتی جا رہی ہے، بتدریج ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ متحدہ ہندوستان میں جدید و قدیم قوتوں کے درمیان پیدا ہونے والا تصادم جن منطقی نتائج تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا، یہاں پاکستان میں کامیابی حاصل کر لے اور جس کے گہرے تاریخی اثرات نہ صرف مسلم ممالک میں ہی زندگی کو تبدیل ہونے میں مدد دیں گے بلکہ غیر مسلم معاشروں پر بھی اپنے مستقل نقوش چھوڑے گا۔

اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ علماء کرام کی ان خدماتِ جلیلہ کا انکار کیا جائے جو انھوں نے قدیم مذہبی ادب اور تعلیمات کی حفاظت کرنے اور اسے درس و تدریس کے ذریعہ زندہ رکھنے کے سلسلہ میں کی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید تعلیم یافتہ ذہن اس ذمہ داری سے سرخرو نہیں ہو سکتا تھا۔ مستشرقین نے ہمارے مذہبی ادب کی حفاظت اور اسے نئے سرے سے مرتب (EDIT) کر کے شائع کرنے میں کافی محنت سے کام لیا۔ مگر درس و تدریس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذریعہ اسے زندہ رکھنے، مساجد کی حفاظت و امامت جیسے عملی امور کی نگہداشت، جن کی وجہ سے امّتِ مسلمہ دیگر امم مذہبیہ سے ممتاز و شناخت ہوتی ہے، صرف علماء ہی کی بدولت سرانجام پا سکے۔

مگر شکایت صرف اس بات کی ہے کہ اس حفاظت و نگہداشت کے عمل کو علماء کرام نے اس طرح سرانجام دیا، جیسے آثارِ قدیمہ کے نوادرات کو محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں دیا جاتا ہے۔ یعنی ان کی ہیئت، ضخامت یا ڈیزائن میں کسی قسم کی کمی یا اضافہ کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ عمل مخطوطات اور اثری اشیاء کے لئے تو صحیح ہے مگر اسلام کے لئے درست نہیں، کیونکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ اور زندہ اسی چیز کو کہا جا سکتا ہے، جس میں وقت کے سیلان کے ساتھ ساتھ تبدیلی بھی واقع ہوتی رہے، اثری نوادرات میں چونکہ ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور یہ وقت کے تجدیدی عمل سے غیر متاثر رہتے ہیں، لہٰذا وہ مردہ کہلاتی ہیں، جن کا زندہ معروضی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلام اگر ہمیشہ تک کے لئے ہے تو اسے وقت کے تجدیدی عمل کے ساتھ ساتھ خود تبدیل ہونا ضروری ہے ورنہ وقت کا قاضی اس کے مُردہ ہونے کا فتویٰ صادر کر دے گا، جیسے دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے متعلق وہ فیصلہ دے چکا ہے چونکہ انسانی عمل فطرت کے جدلی قوانین (DIALECTICAL LAWS) کا پابند ہے اس لئے یہ عمل ہمیشہ ایک پہلو کی جانب جھکا رہتا ہے۔ یہ جھکاؤ کبھی راست پہلو کی طرف اور کبھی چَپ کی طرف ہوتا ہے اور یہی جھکاؤ اس کے دائرہ میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ ایک دائرہ سے دوسرے وسیع تر دائرہ میں قدم رکھتا ہے۔ علماء کے اس عملی جھکاؤ نے اپنا ردّ عمل پیدا کیا، ایک ایسی تحریک نے جنم لیا، جس نے دوسری انتہا پسندی کو اختیار کر لیا ہے اور ان دونوں انتہاؤں کے ٹکراؤ سے ایک نئے اُسلاف کی تشکیل بتدریج وجود میں آرہی ہے۔

مسائل حیات کی طرف نبوّتی رسائی (PROPHETIC APPROACH) ہمیں بتاتی ہے کہ تکمیل ذات اور فلاحِ دارین کے لئے محض روحانی بلندی کا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معروضی حقیقت اور اس کی مسلسل تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے نئے تقاضوں پر بھی نظر رکھی جانی چاہیئے تاکہ روحانی بلندی اور اخلاقی پاکیزگی ایک معاشرتی قدر بن سکے اور محض فرد کا پرائیویٹ یا نجی معاملہ بن کر نہ رہ جائے، کیونکہ معاشرتی قدر بننے سے ایک ایسا ماحول تیار ہو جائے گا جس میں ہزاروں افراد اس سعادت سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔ لہٰذا اس بات سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد یا چند افراد کا ذاتی تقدّس اور علوِّ اخلاقی کا حامل ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن جاتی کہ وہ معروضی حقیقت کا صحیح شعور بھی رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کا تخمینہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح ان سے اجتہادی غلطی بھی سرزد ہونے کا امکان باقی رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمان کے استدلالی پہلو کا، جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اس فرمودہ میں بیان فرمایا ہے، لی مع اللہ وقتٌ لایسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ وملکٌ مقربٌ (مجھے اللہ کی معیت میں ایسا وقت نصیب ہوتا ہے کہ اس میں میرے ساتھ نہ کسی نبی مرسل کو گنجائش ملتی ہے نہ مقرب فرشتے کو) اپنی ذات کی گہرائیوں میں تحقق ہی دراصل مقصود حیات اور تکمیل ذات کے لئے لابدی ہے۔ مگر یہ بھی بدیہی حقیقت ہے کہ تحقق کا یہ عمل زمان کے متسلسل رخ سے ہوکر گزرتا ہے اور یہ پہلو چونکہ معروضی حقیقت کے ساتھ لزوم رکھتا ہے۔ اور معروضی حقیقت ہمہ دم بدلتی رہتی ہے اور اس کی یہ غیر منقطع اور مسلسل تبدیلی ہی ذات باری تعالیٰ کے حیّ و قیوم اور خالق و ربّ ہونے کی سب سے اہم دلیل ہے اس لئے استدام کے تحقق کا یہ عمل اس کے متسلسل پہلو سے الگ متصوّر نہیں ہوسکتا اور زمان کے اسی متسلسل پہلو کو نبئ حکیم نے اپنی ایک دوسری حدیث قدسی میں واضح فرمایا ہے:

لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ (دھر کو بُرا نہ کہو، بے شک دہر ہی اللہ ہے) دھر زمان کا تخلیقی پہلو ہے اور اس تخلیقی پہلو کو ہی زمانِ متسلسل اور معروضی حقیقت دونوں نام دیئے جاتے ہیں۔

لہٰذا علماء کرام اپنے دینی علم و فضل کے ساتھ اگر زمانِ متسلسل کے مجدّدانہ عمل سے پیدا ہونے والے نت نئے معاشرتی تقاضوں کو بھی اپنالیں اور قرآنِ حکیم کے محکمات کی روشنی میں زندگی کے ہر ارتقائی مرحلہ پر اس کے معاشی، سیاسی، فکری اور تہذیبی پہلوؤں کو نئے سرے سے مرتب کرتے چلے جائیں تو یقیناً حیات اپنے مقصد کو پالے اور نبی اکرمؐ کے الفاظ میں "زمانہ اپنی گردش میں وہاں پہنچ جائے، جہاں سے وہ پیدائش کائنات کے وقت چلا تھا۔" (خطبہ حجۃ الوداع)

آخر میں اقبال کے الفاظ میں ملّتِ اسلامیہ کی اصلاح و ترقی کے لئے درد مند دل رکھنے والے بہی خواہوں کی خدمت میں عرض ہے

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم = قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر = کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

© rasailojaraid.com